ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری

اور

کچھ اُن کی زبانی

مرزا فرحت اللہ بیگ

قیمت ایک روپیہ

پرنٹر سرفراز پریس   پبلشر   فخر بکڈپو فتح پور بارہ بنکی

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری

اور

کچھ اُن کی زبانی

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی[1] مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ اُن کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ اُن کا طرز بیان ہماری تحریر کا زیور ہوتا تھا۔ اُنکی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی ۔ اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ انکی تکلیفیں، خود ان کو یہ نم اور ہم کو تڑپاتی تھیں۔ اور آج وہ دن ہے کہ ان کے حالات زبان قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی "اخوت اسلامی" کا سبق پڑھے ہوئے تھی اُسکو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے۔ اُس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑہ۔ وہ اپنے دست و بازو کے بھروسہ پر اُس میدان میں اُترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا، جس کام میں ہاتھ ڈالا اُس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بخوبی ثابت

---

[1] ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب

کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو بآسانی ہٹائی نہ جا سکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ I AM A SEFMADEMAN کا فقرہ ضرور استعمال کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے، جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں، یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری، ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آباد اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے انکو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ "میاں اگر لفٹننٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کلکٹر تو ہو جاؤ دس روپیہ کے اہلکار ہو کر باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی"

بہرحال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا، بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں اینچ پیچ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں لیکن رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالہ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بیدھڑک لکھوں گا خواہ کوئی برا مانے یا بھلا جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں

دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانحعمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔ جس موقعہ پر جو کچھ سنا یا دیکھا اُس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کرونگا کہ جہانتک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کئے جائیں۔ انشاء اللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کریں گے۔

اب رہا طرز بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا انکا منھ چڑانا ہی نہیں اُن کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو کہ سید انشا کو میر اور مارک ٹوئن کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انہوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضعداری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔

چل بسے خابسلمہ اللہ

سنہ ۱۹۰۳ء میں میں نے اور میاں دانی[1] نے ہندو کالج دہلی سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہوگئے۔ ایف۔ اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی اے میں عربی لیلو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملیگی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکونگا یا نہیں، جھٹ راضی ہوگیا القصہ ہم دونوں بی اے کے درجہ ابتدائی میں شریک ہوگئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جلیل الرحمن صاحب تھے۔ بڑے اللہ والے لوگ تھے عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوف کی باتوں ہی میں گذر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کرلیتا تھا۔ اب رہا صرف و نحو تو اس میں تو کورا کا کورا ہی رہا سنتے آئے ہیں کہ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی" لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے"۔ ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دیکر کعبۃ اللہ چلے گئے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے۔ اُن سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انھوں نے کورا جواب دیدیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کرلو۔ میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی۔ اب میرے کہنے سے تم سائنس لیلو۔ جس سہولت کی بناء پر تم نے میرا مضمون

---

[1] ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب۔

بدل دیا گیا تھا۔ اب اسی سہولت کے مدنظر اپنا مضمون بدلا، بقول شخصے کہ "مرتا کیا نہ کرتا" وہ
راضی ہو گئے دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے
کا وقت نہیں رہا۔ لکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں
شریک امتحان ہونا پڑ گیا "سنگ آمد و سخت آمد" جب وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی
بڑھا گئے" کی صورت آن پڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی، دونوں سر ملا کر
بیٹھے مشورے کئے، ریزولیوشن پاس ہوئے۔ آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودۂ
کلاں بردار" کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہئے۔ دلی میں دو تین بڑے
عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحٰق صاحب، دوسرے شمس العلما مولوی ضیاء الدین
خانصاحب ایل۔ ایل۔ ڈی، اور تیسرے مولوی نذیر احمد خانصاحب پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت
نہ تھی اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب کے نام پڑا۔
گرمیوں کا زمانہ تھا مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد دہلی میں رات کے دس گیارہ
بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی
سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، مولوی صاحب نہ آج نکلتے
ہیں نہ کل، خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ
پاؤں جھٹک کر خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے
تھے اس لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی ہوئی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے
سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی
چہرہ سرمگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی
جوتیاں نظر آئیں، آہستہ آہستہ انھوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس

نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے
پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر اُن کو جا لیا اور نہایت ادب سے دونوں
نے جھک کر فراشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے
ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے
بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے آگئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا
ٹھٹکے پوچھا "میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا۔ کیا مجھ سے کوئی کام ہے" ہم رام کہانی
بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے "تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن
ہوں" جھنجھلا سی لہجے میں یہ الفاظ ادا کئے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے "تمکو معلوم ہے کہ میں
سی آئی۔ڈی کا انسپکٹر ہوں" لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم
امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں، فرمانے لگے کہ "تم کو تعلیم دینا
اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجئے" ممکن ہے کہ مسئلہ
کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا
حلف لے لیا ہو، بہر حال کچھ بھی انہوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا
دیکر اور نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب
اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہیں یہ دونوں قطاع الطریق
پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرزِ عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں
کو مضمحل کر دیا تھا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب ٹ
کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو امید نمبر ۲ پر پانی پھر گیا، لیکن
آئندہ کیلئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے

ایسے رستم کو پچھاڑنے کیلئے اشتعال بننا ضرور ہے۔ وہیں یہ مشیر حصہ دلی پر بیٹھ کر کونسل ہوئی
اور ریزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا
جائے اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجیے اُنکے والد کا نام سراج الدین صاحب
تھا نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے، جوتوں کی دوکان تھی مولوی نذیر احمد صاحب
اس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے
عبدالرحمٰن گو میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب
کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چنانچہ انہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے۔ ایل۔
ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ انہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہانتک کہ
مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اُنکی ٹکر کا دہلی میں کوئی مسلمان
وکیل نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایف اے میں پڑھتے تھے۔

بہرحال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا
شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہار مطلب کیا۔ کہنے لگے کہ بھئی مولوی
صاحب کو فرصت کم ہے کہیں انکار نہ کر بیٹھیں میں نے کہا کہ میاں عبدالرحمٰن تم اُن
تک ہمکو پہنچا دو اگر ہوسکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہدو۔ آگے ہم جانیں اور
ہماری قسمت۔ وہ راضی ہوگئے اور کہا کہ شام کو آٹھ بجے دوکان پر آجانا میں مولوی صاحب سے
ملوادونگا" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب
کی دوکان پر پہنچے یہ دوکان فتحپوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی
صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فرشی سلام کیے اور
خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن

۱؎ یہ دہلی کے بڑے وکیلوں میں تھے۔ اور اب پاکستان میں چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہیں

ہمارے پاس آ بیٹھے، مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا۔ دھتکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑیگا سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔ "مرتا کیا نہ کرتا" میں نے یہی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اس پار۔ مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے۔ مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔ قصہ مختصر مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا یہ دونوں صاحب کون ہیں۔ عبدالرحمن نے ہمارے نام بتائے۔ کچھ الٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کئے۔ اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے میں نے دل میں کہا "ہمارے برتے کھیلا جوا، آج نہ ہوا کل ہوا"۔

اب میاں عبدالرحمن کو رہنے دو۔ جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل و مرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا تو فرمانے لگے "تو عربی چھوڑ دو سائنس پڑھو بیٹا آجکل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ہاں مثل ہے "پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل"۔ فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا"

اُن کی اس پرمذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے، ہم رہنے والے ٹھیرے جامع مسجد کے نیچے کے بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون در آسکتا ہے۔ ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے۔ اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ داتی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ "یہ تو غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دلی

میں کیا مولویوں کا کال ہے مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔میں نے عرض کی کہ "جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں۔" کہنے لگے "نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئیگا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی، جناب شمس العلماء مولوی ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، اُن کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔" میں نے کہا "اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں" کہنے لگے "میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔" یہاں تو چلے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا، بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ "بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہئے ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ انکے اوصافِ حمیدہ و خصائلِ پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اس طرح معرضِ بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤنگا مگر تم بھاگ جاؤ گے۔" ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا "نہیں ہرگز نہیں" مولوی صاحب نے کہا کہ "چھٹی ایک دن کی بھی نہ ہوگی" ہم نے کہا "بہت خوب" مولوی صاحب نے کہا کہ "عید بقرعید کو بھی آنا پڑیگا" ہم نے کہا کہ "بہت مناسب کل کس وقت حاضر ہوں" مولوی صاحب تھوڑی دیر تک انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے، اس کے بعد کہا "دوپہر کو ڈیڑھ بجے" ہم نے کہا "بہت خوب" چونکہ ان باتوں میں رات زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے مولوی صاحب دوکان پر سے اٹھے ہم سب نے سلام کیا اور وہ وعلیکم السلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے، یہاں میں یہ ضرور کہونگا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر ہماری بیچ میں بڑی مدد کی ہم دونوں بھی خوش خوش اُٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام کر کے دوکان سے چلے

راستہ میں دانی نے کہا۔ "میاں مرزا بڑے میاں نے مار ڈالا کبھی گیارہ بجے کالج سے پڑھ
کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائینگے
دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑیگی، کہاں چاوڑی[1]
اور کہاں کھاری باؤلی[2]، جون کا مہینہ کہیں راستہ میں لو لگ کر میں نہ ہو جائیں"۔ میں نے
کہا میاں دانی کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آجائے مگر انکو آخر تک
رحم نہ آنا تھا نہ آیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے سے تعلیم کا وقت
مقرر ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار
ہو گئے، بیچاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انھوں نے جو وقت ہمکو دیا تھا وہ اپنے
آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے، نہ
ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے۔ نہ ان
دو سال میں ایک دن ناغہ کیا۔ یہاں تک مولوی صاحب بھی کہتے تھے کہ "میاں جب
تم دونوں آتے ہو تو میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیونکہ میں تم میں کی بو پاتا ہوں
میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیونکر حاصل ہوتا ہے،
پڑھانے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کے لونڈوں پر اگر ایسی بپتا پڑے
تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں مگر (میری طرف دیکھ کر) استاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں، تم صرف
بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو، دانی کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کرے گا مگر تم
کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاء اللہ پانچ چھ ہی برس میں میری ساری محنت
اکارت کر دو گے" خدا کے فضل سے انکی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی[3] ہم کا ذکر کر دوں، میں

[1] دہلی کے ایک محلہ کا نام [2] دہلی کے دوسرے محلہ کا نام۔

مولوی صاحب کی شکل و صورت، مکان کی حالت انکے رہنے سہنے کے طریقے اور
ان کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا
صحیح اندازہ ہو سکے لیکن سینو میٹوگراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے
متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائیگی لیکن آپ
تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانحمری لکھتے تو
اسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ انکی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی اُن کے حالات
لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی، ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب
کی سوانحمری کے کسی ٹھیٹھ ملا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی۔ خدا بہتر جانتا
ہے کہ اسوقت کبھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالم بیخودی مجھ پر
چھا جاتا ہے مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی
قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرز بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے
نہ مار دے، وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان
کو ہنسائیں، یہی وجہ تھی کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت
شوخ ہو گئے تھے لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مقطع اور مسمے
شاگردوں سے نفرت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب
کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں صرف اس کا یہی جواب دوں گا کہ

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

لیجئے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنیئے:۔
رنگ سانولا گندم گوں تھا۔ قد خاصا اونچا تھا۔ مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دہرا

بدن، گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل، فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش
کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح ہر مردوں کا پھیلا ہو جاتا ہے بس یہی
کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ
اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا گھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی
تھی کہ گھر میں ازاربند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک
گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پاؤں اڑسنے
کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو
قطب بنے بیٹھے رہتے تھے اگر اُٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو ملتوی
کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ضرورت نے بہت مجبور کیا تو ازاربند کی گرہ یا تہمد کے کونوں
کے اڑسنے کا دباؤ تو ہم پر ڈالتے تھے، سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی
کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے سے رہے سہے بال تھے
وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ کگر سفید مقیش
کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا
اندر دھنسی ہوئی تھیں، بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں، آنکھوں میں
غضب کی چمک تھی۔ وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں
شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو مسکراتی ہوئی آنکھیں کہوں
تو بیجا نہ ہوگا۔ کلہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے
سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس
کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے، آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے جو سنے تو

یہ سمجھیے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا سمجھتا کہ مارے
لوٹ رہا ہو، جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترنم بج رہا ہے
اسی لئے بڑے بڑے جلسوں پہ چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں
کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا، ناک کسی قدر چھوٹی تھی، اور نتھنے بھاری
ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں "گاجر" اور دلی والوں کی بول چال میں "پھلکی"
کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا
کر دی تھی، ڈاڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا کلے
تو کبھی قینچی کے منت کش نہیں ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا
تھا۔ ڈاڑھی کی وضع قدرت نے خود فرینچ فیشن بنا دی تھی، بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح
دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اکس ریز (X RAYS) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز، ٹھوڑی
چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی
لیجئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجئے، جنھوں نے اسٹیج پر ان کو
شالی رومال باندھے، کشمیری جبہ یا ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انہوں نے
عالیجناب شمس العلماء مولوی، حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی ظلہ العالی
کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ ان کے گھر کے اور باہر کے لباس
میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر انکو زمانہ یا باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا، تو لباس کی مد میں ان
کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی جب شام کو گھر سے نکلتے تو شوماتر کی ٹوپی یا چھوٹا
سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے، گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید

کرتہ پیجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبہ چونکہ سراج الدین صاحب یہیں دہلی تھا اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کیلئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پہ میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑ ناک ہو گئے تھے، انہی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا جرابوں سے انہیں ہمیشہ سے نفرت تھی گو دربار میں جانے کیلئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھئے، آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلئے چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آیئے، اُلٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں سے گزر کر لال کنویں پہنچئے، آگے بڑھئے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے وہاں سے آگے چل کر تیرے بانس میں آیئے، یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے نکڑ سے ذرا ادھر ہی داہنے ہاتھ کو ایک گلی مڑتی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے، بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے، یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دوکانیں ہیں انہی دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑتی ہے، تھوڑی ہی دور جا کر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے، مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے، صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا، دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں، دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے، سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا کرتے ہیں اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولھے بنے ہوئے ہیں آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ تو باورچی خانہ

کا جز ولاینفک ہیں سرے سے ندارد ہیں، آگ صرف حقہ کیلئے سلگائی جاتی ہے
کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے، دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے اور اندر
ایک لمبا کمرہ، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں
کمرے کے دروازے بند ہیں، ایک کھلا ہے، باہر ایک بڑھیا پھونس جیاری بیٹھی پنکھے کی
رسی کھینچ رہی ہے، ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا، مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا
کے فضل سے انکے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے، نہ کرتہ ہے نہ ٹوپی
نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی
ہے لیکن گردہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اُجلی چاندنی کا فرش ہے ایک طرف
پلنگ بچھا ہوا ہے کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے سرہانے تکیہ رکھا ہے مگر اسکی رنگت کا
بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے، البتہ جس گاؤ تکیے سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف
ہے، قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا
ایں چہ کارست کہ کردہ" تو انشاء اللہ یہی جواب ہے گا کہ "مخرب را درون خانہ چہ کار"
جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصہ میں رہتے تھے چلئے وہاں کا نقشہ بھی دکھا دوں، صدر
دروازہ سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلاء ہے،
اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے، دروازے سے گذر کے چھت پر آتے ہیں، سامنے ہی
ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسلخانہ کے بالکل مقابل دوسری طرف
ایک چھوٹا سا کمرہ ہے آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے، جس زمانے میں ہم
پڑھتے تھے تو انکی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے۔
اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقہ اسکی حقیقت

کیا حقہ بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا، مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی، فرشی قیمتی تھی، مگر چلم پیسے کی دو والی، اور نیچہ تو خدا کی پناہ۔ اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی، ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دیکر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے، خیر جاڑے کا موسم ہے مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور ہمارے سر پر کنٹوپ ہے، مگر بڑا دنیا لوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں لٹکتی ہوئیں، کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے اوپر صندلی رنگ کا ڈھسہ پڑا ہوا، لیجئے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو، چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی پانی تیار ہے؟ جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسلخانہ میں گئے، کپڑے بدلے (یا یوں کہو جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو لیجئے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغنا کے کئی باعث تھے۔ اول تو یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گذر جاتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے جس کو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جا کر اُن سے مل آتا تھا، جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو اُنکے

شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال، اور ظاہر ہے ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ نہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں لباس سے اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے۔ اُن کو جس طرح آرام آتا اسی طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے، نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو" کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا" پر عمل کرتے۔ اہل عالم نہ گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالم بھی بن جاتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر پر کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی، یا کم سے کم انکا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی۔ گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کا ٹھڑا ٹو بدھو نفر، ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پرواہ کہ خدا کی پناہ، ظالم نے ہر ا نکر کام سے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا، مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑیں اس کو کبھی نہ سنائی دی، اور جبتک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ سُنی کو اَن سُنی کر دیا، البتہ حقہ کے معاملہ میں بڑا تیز تھا، یا تو اُس کو یہ خیال تھا کہ حقے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا دشوار ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمباکو زیادہ صرف کرنے میں اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے۔ غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا اسلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اُٹھا کر چلا، مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہار ہے اُس نے جا چلم اُلٹ دی۔ دوسرا سلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو اگر م حقہ ٹھرک گیا، میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر تو اٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی، غرض سارے دن ان کا یہی کام تھا اور وہ اس میں بہت خوش اور مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا

کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پرست اسکی پابندیٔ
اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں نے
صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں کہ آندھی آئے مینھ آئے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن
ہال کی لائبریری میں آتے تھے، اِدھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا
اور اُدھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک مشرق میں
رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں، یہ تین شخص کون تھے؟ ایک منشی ذکاءاللہ صاحب، دوسرے
رائے بہادر پیارے لال صاحب، اور تیسرے مولوی صاحب، ایک چیلوں کے کوچہ سے آتا تھا
دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آکر دوسرے
کا انتظار کیا ہو، اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنیوالا ایسا
بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا. میں نے خود اپنی آنکھوں سے
دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا چھ بجے
سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جاکر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی
ہوں گے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں، دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم
نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں۔ ان کے اس نظام اوقات
میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا، وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے
عادی تھے، گرمیوں میں اُٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے ان
کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ میں نے
دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا، صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے، ادھر ذرا دن
چڑھا اور مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا، اس جماعت

یں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ ان کی تعداد کوئی ۱۵-۱۶ تھی محنت ایسی
کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے لیکن تھوڑا ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی ان سے
نیچ ہو جاتے تھے، خوش مذاقی تو انہیں چھو کر نہیں نکلی تھی، خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق
بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا
سوء ادبی سمجھتے تھے، اب ان کے وہ عمامے اونچے اونچے، یہ یہ لمبی لمبی ڈاڑھیاں دیکھو اور
مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو۔ بیچارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض ادا کرتے
جاتے تھے۔ عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ ان فتحپوری کے
ملانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے، کیا کہوں میں ہوں تھوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل
نہیں کا نقشہ ہے، یہ جماعت اٹھی اور مولوی رحیم بخش آنا دل ہوئے، کاغذوں کا ٹھٹھا بغل
میں ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، ادھر فتحپوری کی جماعت نے کمرے سے قدم نکالا اور ادھر
انھوں نے کمرہ میں قدم رکھا، اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع ہوا چونکہ آخر میں مولوی صاحب کے
ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا، اس لئے لکھوانے کا کام اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا، سب سے پہلے
کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی، اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا
جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا، یہ کام سمٹتے سمٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ
بج جاتے، رحیم بخش صاحب کے اٹھتے ہی کھانا آتا، کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ادھر
ڈیڑھ بجا اور ادھر ہم دونوں داخل ہوئے ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اٹھ بیٹھے،
ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے، اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے
چار بجے اور مولوی صاحب غسلخانہ میں گئے، نہائے دھوئے، کپڑے پہن کر نکل کھڑے
ہوئے۔ پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھہرے، یہاں بھی ان کا حساب کتاب تھا، وہاں

کا کھاتہ دیکھا۔ جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے سات بجے تک۔ وہاں ٹھہرے جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا، سات بجے وہاں سے اٹھ کر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے یہاں بھی حساب کیا، عبدالرحمٰن کو پڑھایا، گھنٹہ بھر وہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے، کھانا کھایا، کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے، جاڑے میں پروگرام میں تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے، اس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔ ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا، ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا، پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے اُن کیلئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے منھ میں زیرہ ہو جاتا البتہ ہم دونوں کی صلاۃ کرنا غضب تھا کتنے بھی جاتے تھے کبھی کیا مزے کا خربوزہ ہے، میاں کیا مزہ کا آم ہے، مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ کہا کہ لیا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔ میں نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا (میاں داتی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منھ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں انکو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا بیدریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے، کہا کرتے تھے میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں پھر کبھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے

فائدہ پہنچا ہے، اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کردی بلکہ کچھ نفع بھی
پہنچا دیا ہے بیٹا تم بھی تجارت کرو روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکھیڑ اٹھاؤ گے تو مزہ
معلوم ہوگا۔ جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے۔ اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے
تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ، قرضدار کے یہاں [illegible] روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا
گئے اور جاتے ہی پہلے "غلق" پر قبضہ کیا، اس کے بعد کھاتہ دیکھا، گردی دیکھی، سامان دیکھ
کر بکری کا اندازہ کیا۔ روپیہ جیب میں ڈالا السلام علیکم و علیکم السلام کیا اور چل دیئے۔ دوسرے دوکاندار
کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دہرایا۔ کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے، اعتراضوں
کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے "بھئی حساب جو جو بخشش سو سو" فقرے کے پہلے
جزو سے تو بیچاروں کو روز واسطہ پڑتا۔ لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب
نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے اُن کے کسی قرضدار
کا نقصان ہوجاتا یا دیوالہ نکل جاتا تو پھر اس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے۔ ان کو خیال تھا
کہ دلی کے پنجابی تجارت کو خوب سمجھتے ہیں انکو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے اور اکثر اُن ہی کے
ہاتھوں نقصان اُٹھاتے تھے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک صاحب جنکا نام
ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے تجارت کا ذکر چھیڑا، اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں
کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی ضمانت کے گیارہ ہزار روپیہ کا چیک
مولوی صاحب نے انکے نام لکھ دیا بڑے ٹھاٹھ سے شہر کی مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی۔ مولوی صاحب
جاتے گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے دوکاندار صاحب کی لچھے دار باتیں سنتے چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں
ڈالنے کو مل جاتا اس لئے خوش خوش بغیر حساب کے گھر آجاتے، یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو
چوکنا کردیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔

قصہ مختصر اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اس نے دیوالہ نکال دیا۔ قرقی ہوئی مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس کے بعد آیا، بہت رویا بہت تسوے بہائے، مولوی صاحب بیچارے کو بڑا رنج ہوا، کہا بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے یا اس پار یا اُس پار" چلو گئی گذری بات ہوئی۔ ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاندنی میں جا رہے تھے کچھ جھٹپٹا ہو اتھا کیا دیکھتے ہیں کہ دوکاندار صاحب خوب بنے، عطر میں لسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے، ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اترے اور آکر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے، مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹھک گئے۔ اتنے میں انھوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا، بہت مسکرا کر سلام کیا۔ رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ" یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کے جوتیوں کا صدقہ ہے، مولوی صاحب کے آگ لگ گئی، دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر ان کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لیا۔ لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، انھوں نے خود بھی آکر بہت کچھ توبہ تلا کی لیکن یہ نہ ماننا تھا نہ مانے اور آخر جب اس کو کھک کر دیا اسوقت اُن کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے، مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا ان کے دل میں تھا، کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہئے وہ انھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔

سود لینا دہ جائز سمجھتے تھے، اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اسکا ناطقہ بند کر دیتے، ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے لسّان بھلا اُن سے کون جیت سکتا تھا اور تو اور

خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک
جگہ سے قرض لیکر سب کو ادا کر دیا جائے، قرضہ کس سے لیا جائے یہ ذرا ٹیڑھا سوال
تھا، ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر گیا میں نے مولوی
صاحب سے سوال کر ہی دیا، کہنے لگے "کتنا روپیہ چاہیئے" میں نے کہا "بارہ ہزار" بولے
"ضمانت" میں نے کہا "چوڑی والوں والا مکان" پوچھا "کتنی مالیت کا ہے" میں نے کہا کوئی
ساٹھ ستر ہزار روپے کا، فرمایا "کل قبالہ لیتے آنا"۔ میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی، بڑی جلد معاملہ
پٹ گیا۔ دوسرے دن قبالہ لیکر پہنچا، پڑھ کر کہا "ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دوگے" میں نے
کہا "مولوی صاحب آپ اور سود" کہنے لگے "کیوں اس میں کیا حرج ہے، میں نہ دونگا
تو کسی ساہوکار سے لوگے، اس کو خوشی سے سود دوگے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچا دوگے
تو دین دنیا دونوں میں بھلا ہوگا، آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں، میرا بھی کچھ حق تم پر
ہے یا نہیں، جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جاکر تصفیہ کر آؤ، کل ہی جائداد بنگال بنک کے
نام لکھے دیتا ہوں" میں نے کہا "مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں
اور لیتے بھی کس سے، اپنے شاگردوں سے" کہنے لگے "اس کی پروا نہ کرو، جب مجھ پر
کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا۔ جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا
ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں، تم سے چودہ آنے لونگا" میں نے آکر گھر میں ذکر کیا
ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑہ پر روپیہ مل گیا، اس لئے یہ معاملہ یونہی کا یونہی رہ گیا۔

لیجئے یہ قصے تو سنا چکا۔ اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی
صاحب کی ابتدائی تعلیم کے واقعات جو ان کی زبانی سنے تھے بیان کرتا ہوں۔

ایک دن مولوی صاحب معلقات پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا

جب اس شعر پر پہنچے ؎

ایا ہند فلا تعجل علینا   وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے کتاب رکھ دی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے، ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے شعر میں تو کوئی ہنسی کی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اٹھا ہے آخر جب ہنسنے کا دورہ ختم ہوا تو وجہ دریافت کی، مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے، تھوڑی دیر بعد سنبھل کر بولے" میاں بعض شعر قصہ طلب ہوتے ہیں، یہ شعر میری زندگی کے قصے کا آغاز ہے، اچھا لو سناتا ہوں، مگر پہلے تمہید سن لو، ہم بہت غریب لوگ تھے نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، تعلیم کا شوق تھا، اس لئے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آکر ٹھہر گیا، یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے، اُن سے پڑھتا اور توکل پر گذارہ کرتا مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے۔ انھیں بھی پڑھاتے مجھے بھی پڑھاتے، دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا، تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا، چار پانچ برس میں معلقات پڑھنے لگا، گو عمر میری بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا، پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں ہاتھ میں چھڑی لیکر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا، کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی، کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحکیم ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے تھے، انکے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، اُدھر اُن کی لڑکی نے ٹانگ لی، جتیاں

سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوالیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی، خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی، پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے، جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پہ مارا، نگوڑا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے ابو کا منا سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا، بہرحال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی، تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اکثر ہم دونوں اگلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے، خدا اغریق رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا، بھئی دیکھنا میں نے بھی کیسے مزے کی تاریخ کہی ہے، اس کے بعد انھوں نے عربی کے چار پانچ اشعار کا قطعہ سنایا، مادہ تاریخ "رہا غفر" تھا، میں نے بڑی زور سے "اوں ہوں" کی بجز "کر میری طرف دیکھا اور کہا، کیوں آپ کو اس پر کچھ اعتراض ہے" میں نے عرض کی جی نہیں لیکن اس قطعہ کو سن کر مجھے دبیر کی ایک رباعی یاد آگئی۔ فرماتے ہیں ؎

ہم شانِ نجف نہ عرش اعظم ٹھہرا	میزان میں یہ بھاری کا وہ سبک تر ٹھہرا
اس پلے میں تھا نجف اور اس پلے میں عرش	پہنچا وہ فلک پہ یہ زمیں پر ٹھہرا

بڑے غور سے سنتے رہے پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے۔ نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اس سے یہ رباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہو گی میں نے عرض کی کہ آپ کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کر دو

متعلق ہو جائیگا۔ اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اول تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابل تعریف نہیں ہوتیں۔ دوسرے سرسید کی تاریخ انتقال "غفرلہٗ" پر آپ نے حرف الف کا اضافہ کرکے اس کو اپنا مال کر لیا ہے، مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچا سہی خیر اب اس جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصلی کہانی کو لو" ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے، ایک روز جو کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا، معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہنچا، قد چھوٹا تھا لوگوں کی ٹانگوں ہی سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے، اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں، ایک ایک لڑکا آتا ہے اس سے سوال کرتے ہیں ادھر سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسہ کے پرنسپل صاحب تھے ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لئے اٹھے۔ چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو دروازہ روکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی ڈھکیل رہے تھے، غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہو گیا، دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا، اس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا، اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آ گئے تھے، انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اٹھایا، پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر "کالنقش فی الحجر" ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا میاں صاحبزادے

کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا، پھر پوچھا میں نے پھر وہی
جواب دیا میری عمر پوچھی، میں نے کہا "مجھے کیا معلوم" وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام
کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ
لڑکا کہتا ہے کہ میں معلقات پڑھتا ہوں، ذرا دیکھئے تو یہی سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں
بناتا ہے" مفتی صاحب نے کہا تو کیا پڑھتا ہے؟ میں نے کہا "معلقات! کہنے لگے کہاں
پڑھتا ہے؟ میں نے کہا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں" پھر کہا "معلقات دوں پڑھے گا؟"
میں نے کہا "لائیے" انھوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی میرے ہاتھ میں دی اور کہا "یہاں سے
پڑھ" جس شعر پر انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا   و انظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنی بیان کئے۔ انھوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، میاں دانی تمہاری
طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی مولوی
صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا۔ اس کا ذکر آئندہ آئے گا مفتی صاحب
بہت چکرائے پوچھنے لگے تجھے کون پڑھاتا ہے" میں نے کہا "مسجد کے مولوی صاحب
کہا "مدرسہ میں پڑھے گا" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھوں گا" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ
پر چند سطریں لکھیں اوپر پرنسپل صاحب کو دیکھ کہا "اس کو پریذیڈنٹ صاحب کے پاس
پیش کر دینا" ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا، کوئی سات
آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا۔ اس میں
لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہو گئی ہے، کل سے اس کو آپ کالج
میں آنے کی ہدایت کر دیجئے، اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا،

مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا، خط دکھایا، پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، میں نے کچھ جواب نہ دیا
جب ذرا سختی کی تو میں نے واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لیجا
میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت
میں منشی ذکاءاللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے
میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا، ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہوشیار
تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں
میں نے اپنی سب جماعت والوں کو دبالیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے
اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انھوں نے لہک لہک کر یہ شعر ؎

اباہند فلا تعجل علینا — وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی، کہنے لگے، پرنسپل صاحب کے
کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی — دوسرے پہلو میں جو کمرہ
ہے اس میں ہماری کی جماعت۔ داغی نے کہا "مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا
تھے" مولوی صاحب ہنسے اور کہا "میاں داغی! ہم پڑھتے تھے آج کل کے طالبعلموں کی
طرح چرندوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے (مولوی صاحب اس فقرہ کا استعمال اکثر کیا
کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے
آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھا کل بھولے، تمھاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں
گارے کا بھی ردا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے پتھر بھی ہیں کہیں کہیں چونا اور
اینٹ بھی ہے، ایک دھکا دیا اور اڑ اڑا دھم گری، ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون

پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے، پڑھانے والے بھی ایرے غیرے نتھو خیرے بیکلیان
نہیں ہوتے تھے، ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آج کل کے
عالم محض کاٹھ کے الو ہیں۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو۔

بانا نورد الرایات بیضا   ونصدرھن حمرا قد روینا

میں نے کہا مولوی صاحب پہلے شعر کے معنی تو رہ ہی گئے، کہنے لگے اتنا بڑا قصہ
سنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے، بس اس کے یہی معنی ہیں کہ
تحقیق ایک ملا کا بیٹا، ڈاکٹر، ڈپٹی، شمس العلماء، ایل ایل۔ ڈی ہو گیا ساتھ آسانی
کے بیچ اسی بولی کے، بوجہ اس شعر کے۔

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سنئے اور قصہ کو
سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے دن سے لیجئے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسے سے آئے کھانا وانا کھایا سبق
کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے، مکان کا پتہ پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ بجنے میں پانچ
منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے، دروازے کی ایک چوکی پر
میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا بی چماری رسی ہاتھ میں
لئے اونگھ رہی تھیں، کبھی کبھی رسی کو ایک آدھ جھٹکا دیدیتی تھیں، کمرے کے اندر مولوی
صاحب تھے لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ ایک خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب
ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا اندر زنانہ تو نہیں ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں
تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن ٹن ڈیڑھ بجایا، ہم دونوں اٹھے اور
دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے، گھر میں سناٹا تھا، بی چماری نے سر بھی

اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جارہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ اس میں گردن ڈال کر جھانکا، چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لئے کچھ دکھائی نہ دیا، اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے" اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے مگر بی چھاری اچھل پڑی اور بے اختیار ان کے منہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا "کون ہے" میاں نے کہا "میں اور دائی" مولوی صاحب نے کہا آؤ بیٹا، اندر آؤ، مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی، تھوڑی دیر الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اس کے بعد کہا ایک کتاب میرے لئے بھی لیتے آنا ہم نے اپنی ایک کتاب اُن کو دیدی اور دوسری سے دونوں نے مل کر کام نکالا، کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آئندہ ذکر کرونگا، ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اٹھے تو سب کچھ یاد تھا مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ معلوم ہوتا تھا خوش خوشی گھر آئے چلو اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے، یہانتک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلباء کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالبعلم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اٹھی، وہ آئے، ہم سے ملے اور کہا "بھئی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے، ہم نے کہا "چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا، انھوں نے کہا نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو، ہم نے کہا یار چلو بھی، اگر انھوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ" وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لو! اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا، انھوں نے کہا "لیتے کیوں نہ آئے" ہم نے کہا

وہ ذرا شرمیلے ہیں بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے، انھوں نے کہا، "طالبعلم شرمیلا ہو اور ڈھیٹ نہ ہو، خیر کل ضرور ساتھ لانا، ذرا انکا بھی رنگ دیکھ لوں" شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہدیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملیگا۔ دوسرے دن جب ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر دھنی دئے بیٹھے تھے ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے مولوی صاحب ہمکو دیکھتے ہی پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور کہا لاؤ کتاب، ہم نے کتاب طاق پر سے اُتار اُن کے ہاتھ میں دیدی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آبیٹھے اور کہا "اچھا یہ ہیں میاں رضا! بیچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا "جی ہاں" مولوی صاحب نے کہا "اچھا بھئی شروع کرو"

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا "ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں، کیا منہ میں گھنگنیاں بھر کر آئے ہو، اچھا میاں رضا! تم ہی شروع کردو" رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، مگر اعراب کی غلطیاں کچھ ہم سے کم کیں تو نظم ونسق میاں دانی سے زیادہ بتا دیا۔ ایک آدھ صفحہ تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے، اس کے بعد کہنے لگے "واہ بھئی واہ ہم کو عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے" رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا "بسر و چشم" مولوی صاحب نے کہا "دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا" انھوں نے کہا "جی نہیں" مولوی صاحب نے کہا "اچھا تو میری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا" یہ سنکر وہ بیچارے کچھ پژمردہ ہو گئے، مولوی صاحب نے کہا بھئی رضا یہ میں نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو، میں تم کو ضرور پڑھاؤنگا مگر تم دس

پندرہ روز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہوا کی کرو، اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمہارے کانوں کو نظم و نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا۔ بھئی مجھ سے تو منسودل کے گلے پر چھری پھرتے دیکھا نہیں جاتا۔ بیچارے متبنی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کرے میں اس کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے۔ بیچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستہ میں ہم نے ان کو بہت بنایا۔ دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے اب ہماری بے حیائی کی داستان بھی سن لیجئے! میری عربی نحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی، شروع کئے ہوئے کے دن ہوئے تھے اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقت پڑتی تھی شعر خود بھی کہتا تھا دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اس لئے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا بیانی نی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی میں نے ایک شعر پڑھا، معلوم نہیں کہاں کا اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں کیا پڑھا" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ انھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی ہم نے پھر اعراب بدل دئے۔ اس سے ان کو غصہ آگیا، کہا "واقعی تم پڑھو" انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا کتاب اٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گزر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا نکل جاؤ ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور

نہ میں تمہارے پڑھانے کے لائق" دانی نے میری طرف دیکھا، میں نے دانی کی طرف دیکھا انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا "ہرگز نہیں"، انھوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے، آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے "اب جاتے ہو یا نہیں" میں نے کہا "مولوی صاحب جبتک کوئی دھکے دیکر نہ نکالیگا اسوقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آجائیں گے" مولوی صاحب نے جو یہ بےحیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے" اور کہنے لگے "اچھا نہیں جاتے ہو نہ جاؤ، مگر میں تمکو ایک حرف نہ پڑھاونگا"۔ میں نے کہا "نہ پڑھائیے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ہلے ہیں نہ ہیں گے"، کہنے لگے "بیٹا اسوقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ اب چلے جاؤ کل آجانا" دانی نے پہچانا، میں سمجھا کہ اسوقت اٹھے تو مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر ان کو بٹھا لیا مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے، میں نے کہا "مولوی صاحب پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے، پڑھانا ہے تو پڑھائیے ورنہ ہم کو یہاں سے جانا ہے نہ جائیں گے" آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے، کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہونگے شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے، اچھا بھئی میں ہارا، میں ہارا، اچھا خدا کیلئے کتاب اٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو، دیکھئے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے" میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہوگئے، کہا کرتے تھے اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمہارے شوق کو آزماتا تھا مگر تم نے مجھے ہی کو آزما ڈالا، خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے"۔ یہ بےحیائی نہیں میاں یہ شوق ہے علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے وہ بری بھلی

سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف ونحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے بار بار چھیڑا یا سمجھ لیا جاتا تھا کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے" اس کے بعد معنی بیان کئے، نکات بتائے اور پھر اسی مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے۔ اول تو مجھے یونہی ہزاروں اشعار یاد تھے، دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا، غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعرا اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا، میاں دانی بھی شریک ہو جاتے اگر کوئی شعر قصہ طلب ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گزرا ہوتا تو اس قصہ کے ساتھ اپنا قصہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غرض ایک شعر کی تصریح میں آدھا آدھ گھنٹہ گذر جاتا مگر اس کے بعد جو شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا چنانچہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔ اگر کوئی درسیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلہ میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شرفائے دہلی پر اس طوفان بدتمیزی میں گذری تھی اس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے اکثر کہا کرتے تھے، میاں بیچارا بادشاہ مجبور تھا کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا۔ یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑے آئے تھے انکا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا انھوں نے دلی کو کھکھ کر دیا۔ ایک روز میں دریبہ میں جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی

آ رہی ہے۔ میں بھی دب کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے جھنڈے
والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ، پیچھے کوئی پچاس ساٹھ
سوار تھے، مگر انکی عجیب کیفیت تھی، گھوڑے کیا تھے دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے، بیچ میں
سوار تھے، مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا، یہ گٹھریاں کیا
تھیں دہلی کی لوٹ، جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا، اس کے کپڑے تک اتروا لئے جس نے پیسہ
پیسے والے کو دیکھا، اُسکے گھر پر جا کر دھونی دیدی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعہ کو تو انگریزوں
سے ملا ہوا ہے، جبتک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا، اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی
فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔ غرض خدائی فوجداروں
کا یہ لشکر غل مچاتا۔ دین دین کے نعرے لگاتا، میرے سامنے سے گزرا۔ اس جم غفیر کے بیچوں بیچ
دولہا میاں تھے، یہ کون تھے؟ عالیجناب بہادر خانصاحب سپہ سالار، لباس سے بجائے
سپہ سالار کے دولہا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے، پہنتے وقت شاید یہ بھی
معلوم کرنیکی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کونسا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ، صافے
پر بجائے طرے کے سراسری لگائی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا
بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ
خدا کی خدائی اب ان ہی کے ہاتھ آگئی ہے گلاب گندھی نے جو ان لٹیروں کو آتے دیکھا جھپٹ
سے دوکان بند کر دی اور اندر دروازوں سے چپکا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا
کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اُسی دوکان کے سامنے آکر رکا، بہادر خاں نے ادھر اُدھر گردن پھیری۔ پوچھا
کسکی دوکان ہے" ان کے ایڈی کانگ نے عرض کی کہ گلاب گندھی کی۔ فرمایا اس بد معاش
کو خبر نہیں تھی کہ ما بدولت ادھر سے گذر رہے ہیں۔ دوکان بند کرنے کے کیا معنی، ابھی کھلواؤ۔

خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کے بیچارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا، ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک
سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ "دروازہ کھولو" اور جس طرح "سمسم کھل جا" کے
الفاظ سے علی بابا کے قصہ میں چوروں کے خزانہ کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم سے
گلاب گندھی کی دوکان کھل گئی، بجنسہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا دروازے
کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے، کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان یاری
نہ دیتی تھی، اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے شاید کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے تھے
کہنے لگے تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے؟ لالہ جی نے بڑے زور سے
گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ اٹھ کھڑے
ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کئے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر
تھا یا تیس روپے کا، بہادر خاں نے دونوں کنٹر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا ایک
کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں عطر سونگھا کچھ پسند آیا
ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دم پر، کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا۔ فارورڈ۔ اس
طرح بیچارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپے کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی
دلانے والے چل دیئے، ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا اور ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا، بیچارے
لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی بھئی غدر کے طوفان بے تمیزی میں نقصان جو ہوا
تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا وہ کبھی تلافی
ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین
نصب تھی۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کی نذر
کی تھی۔ اس کا سامنے کا شیشہ بڑی دقت سے تیار ہوا تھا۔ اس انگریز کے خاندان والوں نے

برسوں میں اسے گھس کر تپلا اور اتنا تپا! کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا غرض
یہ کہ دوربین کالج کا سرمایہ ناز تھی، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی
ہوئی ہے۔ غدر کے زمانے میں کسی بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی اس نے جا کر فوج میں
اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازہ سے آکر کالج کے اوپر توپ لگا دی
ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے۔ یہ سننا تھا کہ ساری فوج کالج پر چڑھ آئی
سیڑھیاں لگا سینکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے، ایک کندہ ناتراش نے بندوق کا کندہ
سامنے کے شیشہ پر مارا، چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ایک خاندان کی پچاس
ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی، ان نابکاروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا،
دوربین کی دوربین اٹھا نیچے پھینک دی اور چند ہی منٹ کے اندر دین دین کے نعروں
میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سنے ہیں لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ انکا
موجودہ زمانے میں دہرانا خطرناک ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے
ہم بی اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک جواب مضمون پر انعام مقرر ہوا
اس مضمون کے لئے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے جو کچھ لکھا
جائے شہر کے بڈھے بڈھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور
مجھ ہی کو یہ انعام ملا۔ میں نے اس مضمون میں ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ
قصوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ میں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لئے
واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے اب وہ مضمون دریا برد نہیں تو دریا بام
ضرور ہو گیا مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے اس لئے اب اسکا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سن چکے اب مولویوں کی جماعت کا حال بھی سُن لیجیے اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار کے ہی لوگ تھے، لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو تھان کی شملیدار پگڑیاں، شملہ بقدر علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے گز بھر لمبی لمبی ڈاڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اٹھا کر پٹھانوں کی گلی میں رکھ دیا گیا ہے محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے، گھوٹتے ایسے کہ باوجود اس محنت کے کورے کے کورے رہتے، مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے "بھئی میاں ان ملاؤں سے عاجز آگیا ہوں، اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔ جواب اس لئے نہیں دیدیتا کہ دل شکنی ہوگی۔ مگر کیا کروں اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں انکی سمجھ میں نہیں آتا، بھلا انکو حماسہ یا متنبی پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے، نوجہ میں نوکر ہوجائیں، محنت مزدوری کریں یا ہینگ کا توڑا گلے میں ڈالکر بیچتے پھریں" ہم کہتے مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں، رگڑے سے پتھر بھی گھس جاتا ہے۔ آخر متنبی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں کہ جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں" ایک روز فرمانے لگے تو آج تم ٹھیر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس نہ دینا ورنہ چھری بھونک دیں گے" اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی، ہم پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ یہ جماعت آگئی یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے اور ہم اٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اس روز مقامات حریری کا سبق تھا، کتابیں کھولی گئیں اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں اعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن حارث کے سفر کا حال تھا اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی اناء اللیل" سے ادا کیا تھا، ان بھلے آدمیوں نے رات کو قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا اس میں شامت اعمال سے "اناء" کے معنی "مٹکے" کے بھی ہیں۔ الشد مے الاعتیدہ لے، انھوں نے

یہاں ٹھکا پھنسا دیا اور نہایت متانت سے "فی اناء اللیل" کے معنی "رات کے ٹھکے میں
سفر کیا ہے" کر دیئے، مولوی صاحب نے فرمایا "اناء کے دوسرے معنی بھی تو ہیں" پڑھنے والے نے کہا جی
ہاں کئی معنی ہیں لیکن اس مقام پر ٹھکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے" ہم کو ہنسی آئی مولوی صاحب
نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا ہم نے سوچا
بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں۔ یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے کہیں کوئی اٹھ
کر گلا نہ گھونٹ دے، ہم نے اجازت چاہی مولوی صاحب کہتے ہی رہے "بیٹھو ذرا اور کچھ
سن جاؤ، ہم نے کہا "مولوی صاحب ہم کو کام ہے کسی اور دن دیکھا جائیگا" یہ کہہ جوتیاں پہنیں سر پہ
پاؤں رکھ کر بھاگے، گھر سے اتنے ہی ہنسنا شروع کیا تو گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رکی
اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے اور "رات کے
ٹھکے میں سفر کرنے" کا فقرہ ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا اور اس کا ذکر فخریہ لہجے میں کیا کرتے تھے
اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچا دی ہے وہ ان کے نزدیک بہت معمولی
چیزیں تھیں، وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اس میں مجھے
جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا اندازہ مجھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کے ترجمے میں
میرا سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے، میاں سچ کہنا کیا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے؟
ہم نے کہا مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے۔ جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب اچھل
پڑے بڑے خفا ہوتے ہوتے رہ گئے "کل کے لونڈو میرے محاوروں کو غلط بتاتے ہو، میاں میری اردو
کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو جب بول جاؤ گے، محاوروں کی بحث
کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ کہا کرتا تھا مولوی صاحب

آپ نے محاوروں کی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ کھپا دینا چاہتے ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو۔ جناب والا اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں، کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے، یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دلی والے ہیں، تھوڑی دیر توجہ کرتے، اس کے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دلی والے سہی، ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے، تم ہم کو دلی والوں کی فہرست نکال دو۔ مگر میاں اپنا ہی نقصان کرو گے"۔

مجھ کو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اول تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی سبب بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گذر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں بیجا وہ محاوروں کی ٹھوسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط معنی میں۔ خدا معلوم انہوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے، ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے، غرض یہ بھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ یہ دلی ہی والا نہیں ہے مولوی بھی ہوں۔ بہر حال ان کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے جو دوسروں کی نقل اتارنا مشکل ہے اور بہت مشکل ہے۔ ترجمہ کرنے کا انہیں خاص ملکہ تھا، وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے مگر ایک

زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہو اکو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اس کا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا، ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے ہم نے اجازت لیکر کتاب اٹھائی اور اول سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں، اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے "میاں! یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لیجاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو خراب نہ کرنا" ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دیئے دیتے ہیں خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے، دو ایک روز میں پڑھ ڈالی، ایک آدھ تصویر بھی غائب کردی، چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی۔ پوچھا، "کچھ پسند آئی؟" ہم نے کہا "مولوی صاحب خوب کتاب ہے" کہنے لگے "اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو" ہم نے کورا جواب دیدیا کہا "دیکھو سنو اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرنا ہے تم سے ترجمہ کراؤں گا، صحیح میں کردوں گا، اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں، اگر اب کے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دونگا" یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحے میرے اور دس میاں وحید کے الگ کردئیے ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی اور وہ آئے اُن کو حکم دیا کہ ایک ایک دستہ بادامی کاغذ ان دونوں کو دیدو، قہر درویش بر جان درویش کی صورت تھی جیسے [illegible] پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح منہ بنائے ہوئے ان پلندوں کو بغل میں مارا گھر آ کر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا، دوسرے روز جا کر پڑھنے کیلئے کتاب اٹھائی، پوچھا "ترجمہ لائے؟" ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا "لائے" کہا "پہلے وہ پڑھو" ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب

اصل کتاب دیکھ کر اس کی درستی کرتے جاتے۔ اب اگر میں یا میاں وائی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانئے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی کیونکہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا، مگر کچھ پروا نہیں اس کا بدلہ اب ہم لئے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے سے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کانٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چونکہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اس لئے ان کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کیلئے ضرور مل جاتا تھا۔ مثلاً اسی حشمتا پہوشتی کی کتاب میں ایک جگہ لفظ STALLI[illegible] آیا۔ ڈکشنری میں جب دیکھا تو اس کے معنی "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے۔ یاروں نے ترجمہ میں یہی الفاظ ٹھونک دئے، جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنے، تو بہت ہنسے، کہنے لگے "واہ بیٹا واہ کیوں نہ ہو، دلی والے ہو، خالص اردو لکھی ہے۔ بندۂ خدا، "شبدیز" لکھ دو، چلو چھٹی ہوئی۔ اب کوئی صاحب اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں، ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے، لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ بہ لفظ، معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے بل بھی نہیں کھاتا۔ بعض اور کتابوں کے ترجمے ہوئے، دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ جوں کا توں ہے، ایک لفظ ادھر سے اُدھر نہیں ہوا، کہا کرتے تھے

سر تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے، اس کتاب کے ترجمہ کا کام تین آدمیوں
کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحب تھے اسکی اصلاح ڈائرکٹر صاحب
کے ذمہ تھی اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سررشتہ دار تھے، روزانہ ایک دو دفعات کا ترجمہ
آتا، ہم ڈائرکٹر صاحب کو سناتے، وہ بڑا اچھا کہتے کہ "یہ لفظ خلاف محاورہ ہے، اس
لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے" غرض دو تین دفعات
کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں، مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی میں
ضرور کہونگا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا باون تولے پاؤ رتی کی کہتا تھا، جو اعتراض کرتا
تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ میاں پرانے زمانے کے انگریز غضب کی اُردو سمجھتے تھے گو آپ بھی
اردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دلی والوں کے کان کترتے۔ میں نے
بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا۔ میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد ذرا خم ٹھونک
کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا، اُردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہی ہے کچھ ٹوٹی
پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کر لیگا۔ یہ
سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا۔ رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار،
لنگوٹ باندھ ترجمہ پر پل پڑا، جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونیوالا تھا ان کا ترجمہ
خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا، ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور
ان لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی، خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا
کہ کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ کہا "اچھا کہو" میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ مجھے
عرضی سمجھے لینے کو ہاتھ بڑھایا میں نے کہا "عرضی نہیں ہے، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے بھی
کیا ہے۔" ڈائرکٹر صاحب یہ سنکر اچھل پڑے، کہنے لگے "تم نے، تم نے ترجمہ کیا ہے؟ پڑھو تو" انگریزی

نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا؟ میں نے کہا، "رائل ڈکشنری سے" انھوں نے ہنس کر کہا "تعزیرات
ہند کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا" میں نے کہا "سن تو لیجئے" کہا "اچھا سناؤ" میں نے جو
پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کہنے لگے "یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے
کیا ہے؟" میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے "کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کرکے لاؤ" میں دوسرے
دن لیکر گیا، بہت پسند کیا اور کہا "تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کرسکتا ہوں جو میرا
اتنا وقت ضائع کرایا، جاؤ تم بھی ان ترجمہ کرنیوالوں میں شریک ہوجاؤ" اس دن سے ہم
بھی پانچوں سواروں میں مل گئے اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات
پر انعام وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیئے ہیں، اگر کوئی کہتا بھی کہ "مراۃ العروس" پر تم کو
انعام ملیگا تو میں اسکو دیوانہ سمجھتا، اصل یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنی لڑکی کیلئے لکھی تھی وہی
پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو "چند پند" لکھ دی تھی میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا
دورے پر نکلا تھا، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ سرکار کے بھی ڈائرکٹر تعلیمات
کا ڈیرہ بھی قریب میں آلگا، شام کا وقت تھا، میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہوکر ہواخوری کو
نکلے، ادھر ڈائرکٹر صاحب آرہے تھے میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا، صاحب ٹھہر گئے، پوچھا
"میاں تمہارا کیا نام ہے؟" انھوں نے نام بتایا، پھر پوچھا تمہارے والد کون ہیں؟ انھوں نے
میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا "کہو میاں کیا پڑھتے ہو" انھوں نے کہا "چند پند" ڈائرکٹر صاحب سمجھے
تھے کہ اردو کی پہلی یا دوسری کہے گا۔ "چند پند" کا نام سنکر پریشان ہوئے کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے
انکے کان نا آشنا تھے کہا "اپنی کتاب دکھاؤ" بشیر نے کہا "جی ہاں ابھی لاتا ہوں ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھئے
گا" انھوں نے کہا "اس کتاب کا کیا نام ہے؟" انھوں نے کہا "مراۃ العروس"۔ یہ دوسرا نیا نام تھا۔ صاحب
نے کہا "وہ بھی لاؤ" میاں بشیر ٹٹوانی سے کود گئے، جھٹ ڈیرے میں آئے اور اپنا

جز دان کھولی "چندر پند" نکالی، اس کے بعد اپنی بہن کے جز دان پر قبضہ کیا، اس نے جو دیکھا کہ بشیر جز دان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی۔ اتنے میں بشیر مرآۃ العروس لیکر بھاگا یہ اس کے پیچھے بھاگی، دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی، خوب بے تا پیٹا ہوا، بشیر بہن کو دھکا دے، کتاب لے یہ جا، وہ جا، بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا۔ میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالہ کیں۔ انھوں نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا "ہم یہ کتابیں لیجائیں گے کل بھجوا دیں گے"۔ انہوں نے کہا لیجائیے، کل ہم کو بھیجنا ہے گی" میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کرلی ہیں، میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے۔ میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا، وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لیکر چلا گیا۔ میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے میں بڑے صاحب ہیں ان میں وہ اتر ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کیا کام۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دونگا، نہیں تو دوسری لکھ دونگا۔ اس نے کہا میں تو وہی کتاب لونگی بڑی مشکل سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا، اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں صبح ہو گئی کوئی سات بجے ہونگے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں۔ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے مرآۃ العروس

پڑھ رہے ہیں، سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند عرصہ میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو مراۃ العروس کو سرکار میں پیش کر دوں، آجکل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں" میں نے کہا آپ کو اختیار ہے یہ کہکر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ وہاں سے انعام ملا یہاں شیر کے منھ کو خون لگ گیا۔ اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں، جو کتاب لکھی اس پر انعام جو لکھا وہ پسند کیا گیا۔ غرض ہم منصف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے، مگر سچی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اسکی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے یہی مصیبت ہم پر پڑی، ادھر کام کی زیادتی، ادھر سرسید کی فرمائشوں کی بھرمار، آج یہاں بھیجدیا، کل وہاں دیا، تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا، خدا خدا کر کے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کر لیا اس کیساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کر لو، لوگوں کو بھی مفید ہوگا اور شاید تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے۔ غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی، اسی ترجمہ کے سلسلہ "الحقوق والفرائض" کا مواد بھی جمع کر لیا، کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک پنتھ کئی کاج ہو گئے۔ مگر سچی سچ کہنا کیسا ترجمہ کیا ہے"
میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ مولوی صاحب مجھکو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں میاں دانی یہ کیا کہا تم نے ابھی تک ہمارا ترجمہ نہیں دیکھا، غضب کیا، ارے میاں رحیم بخش ذرا ادھر تو آنا، وہ سنہری جلد کی حمائل شریف ہے وہ میاں دانی کو دیدو۔ بیٹا ذرا اسکو غور سے پڑھو۔ دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے" غرض حمائل شریف

میاں دانی کے قبضہ میں آگئی۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ کی یادگار
رہے گی۔ جب ہم اٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا "ارے بھئی ایک بات تو
کہنی بھول گیا۔ اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپے ہے، کل ضرور لیتے آنا،
بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز ساڑھے پانچ روپیہ مولوی صاحب نے دھروالیے۔
مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کئے۔ لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا
ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا، یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ
کرتا اور رقم نہ دیتا، میں اسوقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جبتک مولوی صاحب خود نہ فرمادیتے کہ
اچھا بھئی تو یوں ہی لیجا، مگر میرا پیچھا چھوڑ" میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب
قیمت مانگتے۔ میں حجت کرتا، وہ جواب دیتے، میں اُس کا جواب دیتا، غرض بہت کچھ جھک جھک کے
بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا،
مگر خدا غریق رحمت کرے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھکو دیدیتے تھے اور جان بوجھ کر جھگڑتے تھے
ریویو کیلئے جو کتابیں آتیں وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں، وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے
کہ کتاب کے صفحۂ اول پر میرا نام درج ہو کر شہادتِ دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل
اختیار کر لیتا اسوقت بھی میرے پاس اُس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں معلوم نہیں
کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ اُن کے پاس رہی یا نہیں، کتابیں تو کتابیں
میں نے مولوی صاحب کی ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا، ہوا یہ کہ جب
میں اور دانی بی۔ اے میں پاس ہوئے تو جلسۂ تقسیم اسناد کے لئے لاہور جانا پڑا، گون
بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کس کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی میں نے
مولوی صاحب کی گون تاکی۔ ہم دونوں نے مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

اپنی ضرورت کا اظہار کیا، کہنے لگے، بیٹا میری گاؤن بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ سو روپے میں دو گونیں پڑی ہیں بھلا میں کیا خریدتا، یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھیج دیجئے، سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں، سر ولیم میور ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر تھے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے، میاں مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں۔ ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور ہمیں گھر بیٹھے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری مل گئی مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی۔ پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل۔ ایل۔ ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپے روانہ فرمایئے میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندہ بھی آ گیا غرض اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا، دوسری ڈاک سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا۔ پھر دردلش بہ جان دردلش، درزی صاحب کو رقم روانہ کی شرف کو برا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کیا ضرور تھے میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا، بہر حال یہ گونیں ساڑھے چھ سو روپے کی ہیں، معاف کیجئے میں نہیں دے سکتا۔ جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا۔ جو میرے پیچھے پڑا ہے، میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا اس کے بعد بغیر کچھ کہے سنے اٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رخ کیا۔ د،

"ہاں ہاں" کہتے ہی رہے۔ میں نے کنڈی کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی

جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اٹھے میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر کے گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آ گیا۔ مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب انھوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون کے اختلاف، غرض اسی طرح بیسیوں چیزوں پر لکچر دے ڈالے مگر میں بیٹھا سنتا رہا جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا۔ استادوں کی غیبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت، وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اسپیچ دیدی اور آخر میں صاف کہدیا کہ یہ گون میں لیکر جاؤنگا اور ضرور لیکر جاؤنگا اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے "واپس کیا کرو گے" میں نے کہا آپ سرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دیدیجئے، آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ ہو جائیگا۔ مولوی صاحب نے کہا "نہیں بیٹا لاہور سے آکر دیدیجو، مجھے دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے" یہ الفاظ انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ ہی کرتے بن پڑی، آخر میں گون لیکر گیا اور لاہور سے آکر واپس کردی، جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کرلیا، اسوقت بہت خفا ہو گئے۔ کہنے لگے "اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا نہ ہوگا، کل کو میرا کتابوں کا بکس اٹھا کر لے جائیگا، خیر دانی گون لے جاتا تو کچھ ہرج نہ تھا۔ کیونکہ واپسی کی تو امید رہتی مجھے کب امید تھی کہ آپ بزرگ واپس بھی کرینگے وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا جو واپس آ گیا، میں نے کہا "مولوی صاحب اگر پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اسکی تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے ہنس کر کہنے لگے "چلو مشتے بعد از جنگ کی صورت ہے۔ آئندہ میں دینے میں احتیاط کرونگا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا۔ اسوقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہو گئیں مگر اب افسوس ہوتا ہے

کہ گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار رہتی، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیجدے، کیونکہ اس میں میرا بھی حق ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ ہاتھ سے گئی میری غلطی تھی جو اس کو لے جاکر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کرونگا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گون مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدرآباد میں فرنیچر اُن کے سر چپیک دیا تھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا، انکی تجویز اور سرسید کی تحریک پر مولوی صاحب حیدرآباد آئے۔ پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا، اس کے بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے، ہندوستانی وضع کا سامان، تخت چوکیاں وغیرہ خریدلیں بھلا محسن الملک یہ کیونکر دیکھ سکتے تھے کہ اُن کا دوست پرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے، ایک روز سکندرآباد جا المین اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دیدیا اور کہدیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچادو اور بل بناکر بھیجدو، ایک روز جو مولوی صاحب اٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا، فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے، بہت چکرائے۔ لینے سے انکار کردیا مگر نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا جن تھا، وہ کب ماننے والا تھا، آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آبیٹھے اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہوگیا مگر یہ بھی نذیر احمد صاحب تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب انکا تقرر تنخواہ کی صدر تعلقداری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان بہت ہی تھوڑی کمی پر المین کے سر مار انچر دی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے، نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے، نواب محسن الملک دورے پر نکلے، تنخواہ قیام کیا، مولوی صاحب خود

کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ میں آیا ہوں میرے
قیام کا انتظام کردو، ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں ایک دو میزیں تھیں کھول دیا گیا
وہ ایسے والے فرنیچر کی تلاش میں تھے، سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا رکھا
ہوگا اندر کہلا بھیجا کہ میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھیرونگا، پہلے تو جواب ملا کہ وہاں
آپ کو تکلیف ہوگی، مگر جب ادھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا، اندر جا کر کیا
دیکھتے ہیں کہ وہاں صفا چٹ میدان ہے، نہ دری ہے نہ چاندنی، نہ میز ہے نہ کرسی کمرے
کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے اس پر ایک چھوٹا سا کمبل پڑا ہوا ہے بازو میں
ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھی ہے کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے
لوگوں سے پوچھا وہ فرنیچر کہاں گیا" معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کر
آئے بیچارے ایک رات ٹھیرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک نواب محسن الملک اور ان کی بنی رہی بعد میں اتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی۔
مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں محسن الملک
کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہو کر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔
غرض جب عماد السلطنت کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب
کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے حیدرآباد میں صحبت کا جو رنگ
تھا وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب
بیان کیا کرتے تھے ان کا زبان قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے، بعد میں دونوں بظاہر
ملتے جلتے تھے لیکن موقع چوکتا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں سنائے بغیر نہ رہتے تھے
ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے ۱۹۰۳ء کے دربار کے موقع پر کانفرنس

کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا، اس زمانہ میں نواب محسن الملک علیگڑھ
کالج کے سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائنس سر آغا خان تھے۔ آدمیوں کی یہ کثرت
تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ ملتی تھی، ہر جلسہ میں کئی کئی رئیس آ جاتے تھے ایک پورا دن خاص
مولوی صاحب کے لکچر کیلئے مقرر ہوا، مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ
دیا تھا، اس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی، لکچر شروع ہوا تھا
سر لارڈ کچر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤنگا، نواب محسن الملک نے ایسے باعزت اور ذی وجاہت
مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں، مولوی صاحب کے لکچر میں اس سے کھنڈت
پڑتی تھی، پنڈال کے باہر گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچر آئے اٹھ کر باہر جاتے
اور پھر آ بیٹھتے اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے، مولوی صاحب
بہت جز بز ہوئے مگر انکی کون سنتا تھا۔ قصہ مختصر آخر لارڈ کچر آ ہی گئے، نواب محسن الملک
نے سب کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرایا۔ لارڈ کچر کہنے لگے
مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، آج آپ سے مل کر بڑی خوشی
ہوئی، مولوی صاحب نے کہا۔ "لاٹ صاحب مجھے بھی آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی اور سب سے
بڑی خوشی ہوئی کہ آپکی وجہ سے ایک معمہ حل ہوگیا۔" لارڈ کچر نے کہا وہ کیا معمہ تھا، مولوی
صاحب نے کہا "ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اسوقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ
حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ
حمل گرا دیگی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے جب آپکی آمد نے بڑے بڑے پیٹ
والے بڈھوں کے حمل گرا دئیے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرا دے" تمام
پنڈال میں سناٹا ہوگیا مگر مولوی صاحب کو جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے اور اسطرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔

بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر پالیسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چنانچہ
امیر حبیب اللہ خان ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خان بقرعید کے دن دہلی میں تھے، اس روز جمعہ تھا صبح کو
بقرعید کی نماز عیدگاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس
میں دربار کیا، اس دربار میں آٹھ یا نو دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان امیر بلائے
گئے، ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے سر ہنری میکماہن نے ان لوگوں کا تعارف
امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی اور انکی تعریف سر ہنری نے کی تو امیر صاحب
نے کہا، آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں، میں خود انکی تصانیف بڑے شوق سے
پڑھتا ہوں اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں، دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا
ہو گیا۔ اسکے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا، آپ شعر بھی کہتے ہیں، مولوی صاحب نے کہا، جی ہاں
کہتا ہوں لیکن آج آپکی تعریف میں اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤنگا۔ یہ کہکر شبلی کا یہ شعر
پڑھا ۔ عید و عید و عید مجتمعاً   وجہ الحبیب و یوم العید و الجمعہ
موقع کے لحاظ سے یہ ایسا برمحل ہو گیا کہ شبلی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات
اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔ تمام دربار پھڑک اٹھا۔ امیر
حبیب اللہ خان نے اٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے لیے کہ
مولوی صاحب گھبرا گئے۔ دوسرے روز جو انھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا اسکو انھیں کے
الفاظ میں دہرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے۔ بھئی میں تو شعر پڑھ کے مصیبت میں پھنس گیا۔
شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آکر دبوچ لیا۔ اللہ میرے! خیبر کا کوئی سوا گز چوڑا
سینہ میں چھ اچھے قد کا آدمی، اس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پسلیاں ہل گئیں ادھر دم گھٹنے

گا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں جنبش تک نہیں ہوتی، قسم خدا کی اسوقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے، بارے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علیحدہ ہوا ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال کے پھر بوسہ لینا شروع کیا، بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو، کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہکر پھر لپٹ جاتا، لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کرتا بیچارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہونگے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی سے پانی رستا ہے، نا بھائی نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے، کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے، مولوی صاحب گو اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جا رہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی:

اس تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی، جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے، اس میں کسی لفٹنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے سنہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جبتک ہندوستانی یوروپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اسوقت تک ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بڑا غصہ آیا، خدا کی قدرت دیکھو کہ ان کے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے جو ہندوستان کے لاٹ پادری تھے تشریف لائے۔ شامت اعمال سے انھوں نے بھی اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا

کالج کی طرف سے لارڈ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کیلئے مولوی صاحب تجویز کئے گئے اب
کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے، جو کچھ دل میں بخار رہ رہا تھا خوب اچھی طرح نکال لیا
کالج والے حیران تھے کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ
صاحب پر اعتراضات. مگر انھوں نے جبتک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش
نہیں ہوئے، سب سے پہلے انہوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پرمذاق پہلو سے بیان
کیا فرمانے لگے حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون. ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اٹھنے
بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے مگر آجکل کے ہندوستانی صاحب
بہادر پتلون کا ساتھ دینگے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہم اچکن یا انگرکھے
کو اچھا کہیں گے. اس سے ستر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے ہمارے بودے
کے دلدادہ بجائی کوٹ کو پسند کریں گے، یہ کیوں اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے
ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دینگے کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے نرم نرم اور ہلکی
ہوتی ہے، ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے یہ کیوں؟ اس لئے کہ
انگریزوں کا پہناوا ہے ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے انکے
پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں اور ہمیں بھی پہننا چاہیئے، قسمت
نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے، اُن کی ہر چیز ہمارے لیئے قابل تقلید ہے،
اور اُن کا ہر فعل ہمارے لئے چراغ ہدایت، اب افعال سے گذر کر اقوال تک نوبت آگئی
ہے پادری گرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی پیچ چھوڑ دو اور انگریزی پیچ
بولا کرو. آج ہمارے پادری ولیفرائے بھی اُن کے ہمنوا ہوئے ہیں. یا تو انھوں نے یہ سمجھا
کہ یہاں کے پیچ اور یورپ کے پیچ میں فرق ہے اور وقت آگیا ہے کہ یہی سب کی طرح [illegible]

سچ کو اتار پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولائتی سچ پہن لیا جائے۔ یا اُن کا
یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال سات سمندر
پار ولایت سے آیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اب تمہارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے
خدا کیلئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو، یہ بڑے لوگ ہیں
مولوی نذیر احمد یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت
کی اور تم نے ہنس کر ٹال دیا۔ لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانوگے اور ولائتی سچ نہ بولوگے اور یہ
تازہ مال استعمال نہ کروگے تو یاد رکھو نوکری ملنی مشکل ہو جائیگی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں
کو محتاج ہو جاؤ گے، کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری
کا خبط اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو، اسی سے تمہارے دلدر دور ہونگے۔

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ ولیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ لاٹ
صاحب اُردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اس پرمذاق تقریر پر مسکراتے
رہے مگر دل کا خدا ہی مالک تھا، کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں
مگر یہاں تیر از کمان جستہ کی صورت تھی، کیا کر سکتے تھے۔ البتہ دل میں انھوں نے ٹھان
لی ہوگی کہ آئندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دلی میں مولوی
صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ "امہات الامہ" کی وجہ سے مولوی صاحب
پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے کبھی اس کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے، "بھئی مجھے تو اس کتاب میں
کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں۔ تم نے بھی تو
کتاب دیکھی ہوگی۔ آخر تم ہی بتاؤ اس میں میں نے ایسی کونسی نئی بات لکھی ہے میں نے جو کچھ لکھا

نہیں دیکھی تھی مگر میں مولوی صاحب کے طرز تحریر سے واقف تھا اس لئے میں نے
یہی کہا کہ مولوی صاحب آپکا طرز تحریر مذاق کا پہلو لئے ہوتا ہے، وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں
مزا دیتا ہے، تاریخ کی کتابوں اور خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں
سکتا اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو آپکی طرز تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔ مولوی صاحب نے کہا
میرے کلام مجید کے ترجمہ کے متعلق تو یہ اودھم نہیں مچا۔ میں نے کہا اس پر بھی لوگوں کے
اعتراض ہیں مگر اس میں آپکا معاملہ اللہ میاں سے ہے اور یہاں انسانوں سے۔ مشہور مقولہ ہے۔

باخدا دیوانہ باش   و با محمد ہوشیار

کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے " ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو۔ اس قسم کی تالیفات میرے
دائرہ تحریر سے باہر ہیں۔ انشاءاللہ دوسرے اڈیشن میں اس نقص کو رفع کردونگا
جب میں چلنے لگا تو فرمایا کہو بیٹا پھر ملو گے۔ ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں
میں نے کہا انشاءاللہ ضرور آؤنگا۔ ہنس کر کہنے لگے انشاءاللہ کہنے کے بعد تم ضرور
آئے۔ یہ مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام ضرور
کرونگا مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ انشاءاللہ ضرور
کرونگا ہم تو اسکے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اس کام کو کریگا تو ارادہ نہیں ہے ہاں اگر خدا نے چاہا اور
زبردستی یہ کام کرا دیا تو مجبوراً کر لیں گے۔ میں نے کہا " مولوی صاحب آپکو انشاءاللہ کے یہ معنی
پہنانے مناسب نہیں آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں کبھی نہیں چھوڑتے۔ کہنے لگے میاں
پہلے انشاءاللہ کے معنی دوسرے تھے، آجکل کے مسلمان یہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان
کئے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا
اور صبح ہی کے میل سے میں ایسا دلی سے بھاگا کہ حیدر آباد آکر دم لیا۔

دوسری دفعہ جب میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی چھت
پر جو چھوٹا سا کمرہ تھا اس میں آ رہے تھے۔ رعشہ میں اضافہ ہو گیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم
دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے
ہی بڑی زور سے سلام کیا کہنے لگے "میں یہ کون صاحب ہیں" میں نے کہا میں ہوں' پھر پوچھا'
آخر میں کون صاحب ہوئے' نام کیوں نہیں بتاتے' ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی
دیتا ذرا قریب آؤ' میں نے کہا واہ مولوی صاحب واہ' اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب
پہچانا اور مجھے پہچانئے تو بات ہے' ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے "اوہو مرزا فرحت
صاحب ہیں' بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کرے گا آؤ بیٹا ایسے تو کئی برس کے بعد آئے" میں
پاس گیا، گلے لگایا، حالات پوچھتے رہے باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں
کیا بجا ہے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں' کہنے لگے اوہو دیر ہو گئی
ذرا میرا جوتا اور میرا بیگ تو لے آؤ' میں نے لا کر جرابیں پہنائیں جوتا سوکھ کر لکڑی ہو گیا تھا'
زبردستی پاؤں میں ٹھونسا، جوتا پہنکر کھڑے ہو گئے میں نے کھونٹی پر سے اتار کر شیروانی
اور ٹوپی دی، وہ پہنکر کہنے لگے "چلو بھئی وقت تنگ ہو گیا ہے" میں نے کہا مولوی صاحب
آخر کہاں جانا ہے' کہنے لگے "بیٹا آج ایک مقدمہ کی پیشی ہے وہاں جا رہا ہوں' ذرا
مجھکو کشمیری دروازے تک تو لے چلو" میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھی اترے باہر دیکھوں تو کوئی
سواری نہیں' میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کیلئے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا
کیجئے، خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ آخر یہ کس دن کیلئے ہے روپیہ اسی لئے ہوتا ہے
کہ خرچ کیا جائے۔ بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے پھر کیوں بڑھاپے میں آپ
اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ذرا اپنی حالت کو دیکھئے اور کشمیری دروازے کو دیکھئے،

دو میل جانا اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کر دیگا۔ ذرا ٹھہر جائیے میں گاڑی
لے آتا ہوں" بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی
کیا ضرورت ہے۔ اب چلنا ہے تو چل، نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں" ابھی میرے
ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جا سکوں" میں نے
کہا "مولوی صاحب خدا کے لیے اب تو گاڑی رکھ لیجئے، اگر آپ خرچ نہیں اٹھاتے
تو میں اٹھاؤں گا" ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اچھلنے لگا ہے، کیا میرے
پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں، بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس
لئے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا، ایک تو دانہ گھاس
چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ ٹوٹا کل
وہ ٹوٹا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے،
رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہو گئی، اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی
رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے،
اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں، نا بھئی نا، یہ گاڑی رکھنا وضعداری
کے خلاف ہے، میں نے کہا، تو کمیشن جاری کرا لیا ہوتا" کہنے لگے "وہ بھی میری
وضعداری کے خلاف ہے، ہمیشہ کچہری میں جا کر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس
وضعداری کو کیوں توڑ دوں؟ بہر حال یہی حجت کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب
کو اطلاع ہوئی، انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے
پہلے انھیں کا مقدمہ لے کر ان کی شہادت قلمبند کی، اور یہ جس طرح گئے تھے اسی
طرح ہانپتے کانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدر آباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا، جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں، اندر قدم نہیں رکھتا، مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوق کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائینگے

اللہ بس باقی ہوس

(مطبوعہ رسالہ اُردو۔ جولائی ۱۹۲۷ء)
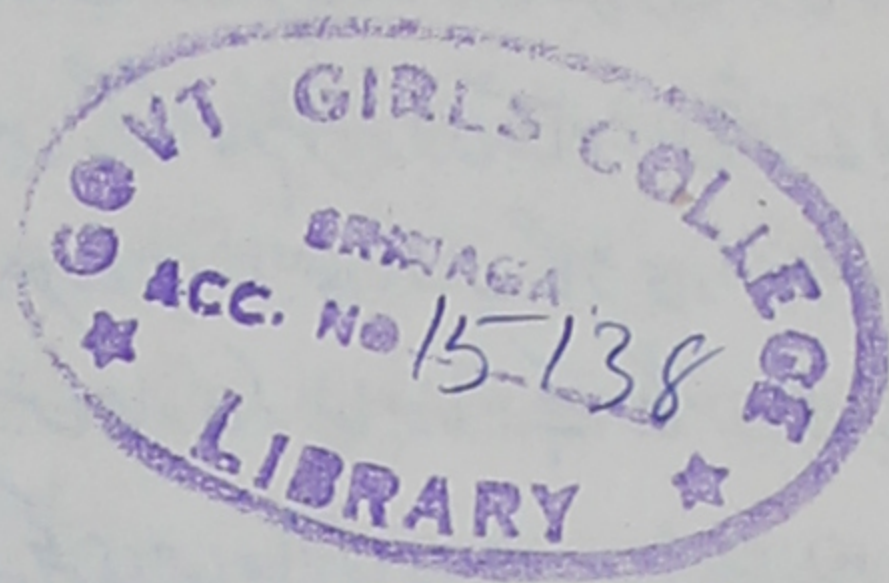
مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے رہنے والے ستمبر ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد (دکن) میں اس جہانِ فانی سے اٹھ گئے۔

فرحت اللہ بیگ کا رنگ نہایت سرخ و سفید، جلد صاف، ہونٹ روتی، دانت چھوٹے اور پیوستہ، چہرہ نہ لمبا نہ زیادہ گول۔ آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی تھیں۔

فرحت اللہ بیگ لڑکپن میں بہت دبلے تھے لیکن آخر عمر میں پیٹ ذرا بڑھ گیا تھا۔

فرحت اللہ بیگ کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ ابتدائی تعلیم اسلامی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں ہندو کالج دہلی اور ۱۹۰۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں داخل ہوئے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے پاس کیا۔

۱۹۰۷ء میں دہلی سے حیدر آباد گئے، اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کی توجہ سے ہیڈ ماسٹری کی جگہ ملی، محکمۂ تعلیمات میں تھوڑے ہی دن رہے، بعد کو ہائیکورٹ کے مترجم مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت اور محنت سے نائب معتمد مقرر ہوئے بعد ازاں عدالت العالیہ کی معتمدی پر فائز ہوئے، کچھ عرصہ بعد سشن جج ہو گئے۔ اور گلبرگہ میں تعیناتی ہوئی، گلبرگہ کے قیام میں مرزا صاحب پر مذہبی رنگ غالب آیا اور آخر دم تک مذہبی مراسم پابندی سے ادا کرتے رہے، گلبرگہ سے حیدر آباد انسپکٹنگ آفیسر کے عہدہ پر

آئے۔ یہ عہدہ ہائی کورٹ کی ججی کے مماثل ہے۔

مرزا صاحب کی مضمون نویسی مزاحیہ رنگ میں شروع ہوئی لیکن بعد کو ادب کی ہر صنف میں انہوں نے کچھ نہ کچھ لکھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کی خاص فرمائش سے مولوی نذیر احمد کی کہانی ان سے لکھوائی۔ بعد میں دلی کا آخری مشاعرہ بھی مرزا صاحب نے مولوی صاحب ہی کے کہنے سے اورنگ آباد کالج ڈے کیلئے لکھا۔ انجمن ترقی اردو کیلئے مرزا صاحب نے دیوان انعام اللہ خاں یقین اور دیوان نظیر اکبرآبادی کو بھی نہایت محنت سے تصحیح کی اور ان پر عالمانہ مقدمے لکھے۔ وہ کبھی کبھی شاعری بھی کرتے تھے لیکن عام طور سے اسے اشاعت کیلئے نہیں دیتے تھے۔" مضامین فرحت، جن کی وجہ سے ان کا نام زندہ رہے گا، سات جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے کردار اور اسلوب بیان کے مطالعہ میں حسب کتب اور مقالات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے:۔

یادگار فرحت .... مرتبہ غلام یزدانی

طنزیات و مضحکات .... رشید احمد صدیقی

مختصر تاریخ ادب اردو .... ڈاکٹر سید اعجاز حسین

مضامین عظمت .... عظمت اللہ خاں

تنقیدی اشارے .... آل احمد سرور

مرزا فرحت اللہ بیگ۔ عزیز احمد۔ مقالہ۔ رسالہ نقوش

خوجی سے چچا چھکن تک۔ خورشید الاسلام۔ مقالہ۔ پیام عصر۔